مولانا سلطان احمد اصلاحی

ترجمان القرآن فراہیؒ کا مسلک حدیث

ترجمان قرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ (۱۲۸۰ھ - ۱۳۴۹ھ) تاریخ اسلامی کی اُن نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے ہیں جو فکر و فہم کی دنیا میں کسی کے نرے مقلد نہ ہو کر اپنی الگ راہ نکالتے ہیں اور اپنے پیچھے افکار و خیالات کی ایک نئی دنیا چھوڑ جاتے ہیں۔ علامہ کی عظمت کے لیے صرف یہ بات کافی ہے کہ وہ اس دور آخر میں تفسیر اور علوم قرآن کے امام کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ علم تفسیر سے متعلق ایسے گوناگوں موضوعات وہ منظر عام پر لائے کہ اس کے ایک ایک جزئیہ کو تحقیق کا موضوع بنایا جاسکتا ہے اور اس کی بنیاد پر 'علم نافع' کے مصداق تازہ افکار و خیالات کی ایک نئی گیتی پیدا کی جاسکتی ہے۔ علامہ کی اسی فکر تازہ کا ایک اہم پہلو ان کا 'مسلک حدیث' ہے جس پر آج کی مجلس میں ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔

افسوس کہ ترجمان القرآن فراہی اپنے پھیلے ہوئے کاموں کی وجہ سے دوسری اکثر و بیشتر چیزوں کی طرح اپنے مسلک حدیث کی بھی تفصیل و تشریح نہ کر سکے، تاہم اپنی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں اور یادداشتوں میں انھوں نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس سے کافی حد تک حدیث کے سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ بنیادی طور پر حدیث کے سلسلے میں مولانا کے خیالات ہمیں ان کے مقدمۂ تفسیر، فاتحۂ نظام القرآن، التکمیل فی اصول التاویل اور ان کی غیر مطبوعہ یادداشت "احکام الاصول باحکام الرسول" میں ملتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا فلسفۂ شریعت اور احکام شریعت دونوں کے سلسلے میں اصل و اساس قرآن حکیم کو قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے خیال کے مطابق اگر کسی موقع پر کسی حدیث کا قرآن سے ٹکراؤ ہو تو قرآن چونکہ قطعی الدلالۃ ہے جس کے الفاظ کی من جانب اللہ ہونے کی ضمانت ہے اور احادیث ظنی ہیں جن میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کے ساتھ بالمعنیٰ روایات کا حصہ بھی کم نہیں ہے، تو اس ٹکراؤ کی صورت میں علامہ حدیث کے مقابلہ میں

قرآن کی ترجیح کے قائل ہیں اور قرآن کی تاویل کے مقابلے میں وہ حدیث کو اس کا زیادہ مستحق قرار دیتے ہیں۔ خواہ یہ حدیث یا روایت اصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری اور اس کی ہم پلہ صحیح مسلم ہی میں مذکور کیوں نہ ہو۔ حدیث کے سلسلے میں علامہ کے اس مسلک کو فقہاء صحابہ میں سے حضرت عمرؓ بن الخطاب، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ جیسے لوگوں کے مشابہ قرار دیا جاسکتا ہے، جس کا کہ ایک موقع پر انھوں نے تذکرہ بھی کیا ہے[1]

حدیث کے سلسلے میں علامہ کے ان خیالات کو ان کے الفاظ میں سُننا مناسب ہے۔ فاتحہ نظام القرآن کے دوسرے مقدمہ جری ماخذ میں حدیث کے ساتھ تاریخ اور سابق صحف سماوی کی حیثیت بیان کرتے ہوئے قرآن کی نسبت سے ان کی حیثیت کی بابت فرماتے ہیں:

من المآخذ ما هو اصل وامام ومنها ما هو كالفرع والتبع، اما الامام والأساس فليس الا القرآن نفسه واما ما هو كالتبع والفرع فذلك ثلاثة: ما[1] تلقته علماء الأمة من الاحاديث النبوية، وما[2] ثبت واجتمعت الأمة عليه من احوال الأمم، وما[3] استحفظ من الكتب المنزلة على الانبياء۔ ولولا تطرق الظن والشبهة الى الاحاديث والتاريخ والكتب المنزلة

ماخذ میں بعض کی حیثیت اصل اور رہنما کی ہے اور بعض کی فرع اور تابع کی۔ جہاں تک رہنما اور بنیاد کا معاملہ ہے تو وہ صرف قرآن ہے۔ باقی فرع اور تابع کی حیثیت سے تین چیزیں ہیں: (۱) احادیث نبویؐ جو علمائے امت تک پہنچیں۔ (۲) قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات۔ (۳) حضرات انبیاءؑ پر نازل شدہ کتابوں کا وہ حصہ جو دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گیا۔ اگر احادیث، تاریخ اور حضرات انبیاءؑ پر نازل شدہ کتابوں میں ظن اور شبہے کا دخل نہ ہوتا تو ہم ان کو فرع قرار نہ دیتے بلکہ سب کی

---

[1] التکمیل فی اصول التاویل، ص ۲۲، الدائرۃ الحمیدیۃ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ (الہند) ۱۳۸۸ھ

من قبل لما جعلناها كالفرع بل كان كل ذلك اصلاً ثابتاً يعضد بعضه بعضاً من غير مخالفة فوجب على من يحاول فهم القرآن أن لا يأخذ من الروايات ما يهدم الاصل او يقلعه فانى رأيت بعض الروايات تقلع الآيات وتقطع نظمها الا أن تاول ولكن التعجب ممن يأول الآية ولا يأول الرواية وربما لا يأول الآية بل يرضى بقطع نظامها والفرع اولى بالقطع[1]

حیثیت اصل واساس کی ہوتی اور سب بلا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے۔ پس جو شخص قرآن مجید کو سمجھنا چاہتا ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ روایات میں سے ایسی کسی چیز کو نہ لے جو اصل کو ڈھا دینے والی اور اُسے جڑ سے اُکھاڑ دینے والی ہو۔ اس لیے کہ میں نے دیکھا ہے کہ بعض روایات اگر ان کی تاویل نہ کی جائے تو آیات قرآنی ہی کو جڑ سے اکھاڑ دیتی اور ان کے نظم کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ لیکن تعجب ہے ان لوگوں پر جو آیت کی تو تاویل کر لیتے ہیں لیکن روایت کی تاویل کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ بلکہ بسا اوقات صرف آیت کی تاویل ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ اس کے نظام کی بھی قطع و بُرید کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اصل کے مقابلہ میں فرع اس کی زیادہ مستحق ہے کہ اس کی قطع و بُرید کی جائے۔

مقدمۂ تفسیر کے اپنے اسی رسالہ کے آخری مقدمہ ۱۲ 'فی تاویل القرآن بالحدیث' (قرآن کی حدیث سے تاویل) میں وہ اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں جس میں احادیث

---

[1] فاتحہ تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان، ص ۱۰، مطبعۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ، الہند ۱۳۵۶ھ

کے ذیل میں بخاری و مسلم کے نام کے ساتھ صراحت ہے:

قد سبق منی القول بأن القرآن ھو الحاکم عند اختلافه بالاحادیث فھھنا نرید الایضاح وکنت افرق عن طعن بعض اخواننا ولکن ذھب بھم الشغف بالحدیث الی ان قالوا ان الحدیث داخل تحت آیة (انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون[1]) ولم یتفکروا فی نتائج ھذا القول. فحان لی أن ارفع رایة الصدق ولا ابالی ولو قطعوا رأسی لدیه و اوصالی[2]

میں یہ بات پہلے کہہ چکا ہوں کہ جب احادیث کا اس سے ٹکراؤ ہوگا تو قرآن ہی فیصلہ کُن ہوگا۔ اس موقع پر میں اس کی کسی قدر وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے بھائیوں کے طعن و تشنیع سے کسی قدر ڈرتا تھا لیکن حدیث سے ان کی محبت نے ان کو اس حد تک پہنچایا کہ وہ یہاں تک کہنے لگے کہ حدیث آیت کریمہ (ہم ہی نے اس ذکر کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) کے تحت داخل ہے اور انھوں نے اس قول کے نتائج پر غور نہیں کیا۔ پس میرے لیے وقت آگیا ہے کہ میں حق و صداقت کا علم بلند کروں اور مجھے کچھ پروا نہیں کہ میرے سر کو میرے تن سے جدا کر دیا جائے۔

اس تمہیدی گفتگو کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

فاعلمات فی قلوب اکثر اھل الحدیث ان مارواہ البخاری والمسلم لامجال

معلوم ہوا کہ اکثر حضرات اہل حدیث کے دلوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ بخاری و مسلم نے جو کچھ روایت کر دیا ہے اس میں

[1] سورۃ الحجر: ۹
[2] فاتحہ نظام القرآن، ص ۳۲

فیه للشك فنورد بعض ما فیھا لکی تعلم ان الله تعالی شنع اتخاذ العلماء اربابا فلا نؤمن بما فھموا من غیر النظر و الفکر[1]

اب کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش نہیں۔ تو اس مقصد سے ہم ان میں سے بعض مثالیں پیش کرتے ہیں جس سے تم کو اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے کیونکر علماء کو خدائی مقام دینے پر شناعت کا اظہار کیا ہے۔ پس ہمارے لیے کچھ ضروری نہیں کہ انھوں نے جو کچھ سمجھا ہے اس کی، بلا سوچے سمجھے تصدیق کر دیں۔

صحیح بخاری کے سلسلے میں مولانا کے ان خیالات کا تذکرہ مولانا عبید اللہ سندھی نے بھی کیا ہے۔ مولانا سندھی کی اس روداد کو ہم انہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

"مولانا حمید الدین مرحوم میرے بہت پُرانے دوست تھے۔ قرآن شریف کے تناسق آیات میں ہمارا مذاق متحد تھا۔ . . . جب تک ہندوستان میں ان سے ملتا رہا حدیث شریف کے ماننے نہ ماننے کا جھگڑا کبھی ختم نہیں ہوا۔ اتفاقاً جس سال میں مکہ معظمہ پہنچا ہوں، اسی سال وہ بھی حج کے لیے آئے، ہماری باہمی مفصل ملاقاتیں رہیں، افکار میں بعد توافق پیدا ہوگیا تھا، مگر وہاں بھی حدیث کے ماننے نہ ماننے پر بحث شروع ہوگئی، ہم نے سختی سے ان پر انکار کیا اور کہا کہ حدیث کو ضرور ہی ماننا پڑے۔ تنگ آکر فرمانے لگے، آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔؟ میں نے کہا موطا مالک! فرمایا، ہم اس کو مانتے ہیں۔ میں نے کہا بس آج سے ہمارا نزاع ختم ہے، ہم آپ کو صحیح بخاری ماننے کے لیے مجبور نہیں کرتے ہیں[2]

[1] فاتحہ تفسیر نظام القرآن، ص ۳۲-۳۳
[2] الفرقان بریلی کا شاہ ولی اللہ نمبر، طبع دوم ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء، مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی، ص ۳۰۲، مضمون

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس پس منظر میں ہم صحاح کی احادیث اور ان میں بھی خاص طور پر بخاری و مسلم کی روایت کردہ حدیثوں پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس میں سے پہلی روایت 'کذب ابراہیمؑ' کی ہے جو بخاری و مسلم دونوں میں مذکور ہے[1] جس کا خلاصہ ہے کہ سیدنا ابراہیمؑ نے تین مواقع پر خلاف واقعہ بات کہی۔ ایک یہ کہ میں بیمار ہوں " انی سقیم[2] " نیز یہ کہ ان بتوں کو ان کے بڑے بُت نے توڑا ہے، " بل فعلہ کبیرھم[3] "۔ تیسرے اپنی بیوی سارہ کو ایک جابر کے ہاتھوں آبرو ریزی سے بچانے کی خاطر انھیں اپنی بیوی کے بجائے اپنی بہن قرار دینے کی تلقین۔ مولانا فراہیؒ اس روایت کو نص قرآنی کی تکذیب کرنے والی 'مکذب لنص القرآن[4]' قرار دیتے ہیں۔ صحیحین کی اس حدیث کے سلسلے میں علامہ فراہی سے سب سے زیادہ قریب تر موقف

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

مولانا عبید اللہ سندھی بہ عنوان " امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف[★] "۔ اس موقع پر مولانا سندھی نے صحیح بخاری کے سلسلے میں اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا ہے۔ مولانا کے ان خیالات کو انہی کے الفاظ میں نقل کرنا مناسب ہے: " رہا یہ کہ صحیح بخاری کے سلسلے میں میرے اشکالات کیا ہیں، اور میں ایک یورپین نو مسلم کو وہ کتاب کیوں نہیں پڑھا سکتا، ان تفاصیل پر میں مجالس عامہ میں گفتگو کرنے کا روادار نہیں۔ اہلِ علم جو تکمیل کر چکے ہیں، یا تکمیل کے قریب ہیں ان سے میں مذاکرات میں سب کچھ کہہ دوں گا۔" حوالہ سابق۔ اسی مضمون میں اس سے پہلے وہ اس سلسلے میں مزید کہتے ہیں: " مگر جس قدر میری توجہ قرآن عظیم کی طرف بڑھتی گئی اور نوجوانوں کو بخاری کی بعض احادیث کا سمجھانا مشکل ہوتا گیا' اسی قدر میرے سابقہ یقین میں تزلزل پیدا ہونے لگا۔" (ص ۳۰۰)

★ اس مضمون کا مفصل جواب حضرت مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ العالی نے ماہنامہ "معارف، اعظم گڑھ" کے فروری ۱۹۴۲ء کے شمارہ میں دے دیا تھا جس کا حوالہ جناب خالد مسعود صاحب کے مقالہ میں گزر چکا ہے۔ (مرتب)

[1] بخاری جلد ۱۔ کتاب الانبیاء، باب قول اللہ عزّ وجل واتخذ اللہ ابراھیم خلیلاً الخ، اصح المطابع، دہلی۔
مسلم جلد ۲۔ کتاب الفضائل، باب فضائل ابراہیم الخلیل صلی اللہ علیہ وسلم، اصح المطابع، دہلی۔

[2] صافات: ۸۹، [3] انبیاء: ۶۳، [4] فاتحہ تفسیر نظام القرآن، ص ۱۰

امام رازیؒ کا ہے جو آیت مذکورہ کی تفسیر میں اس روایت کے ذکر کے بعد سیدنا ابراہیمؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر کے بالمقابل حدیث کے راوی کی طرف کذب کے انتساب کو زیادہ قرین قیاس باور کرتے ہیں۔ اس موقع پر امام موصوف کے الفاظ کو نقل کرنا مناسب ہے:

... قلت لبعضهم هٰذا	... میں نے طبقۂ محدثین کے بعض
الحديث لا ينبغي أن	لوگوں سے کہا کہ یہ حدیث اس کی
يقبل لأن نسبة	حقدار نہیں کہ اسے قبول کیا جائے،
الكذب الى ابراهيم	اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف
لا تجوز فقال ذٰلك	کذب کا انتساب درست نہیں ہوسکتا
الرجل فكيف يحكم	ہے۔ تو ان صاحب نے کہا کہ تو پھر
بكذب الرواة العدول	عادل راویوں کے کذب کا فیصلہ کیونکر
فقلت لما وقع التعارض	کر دیا جائے؟۔ اس پر میں نے کہا
بين نسبة الكذب	کہ جب تعارض کی یہ صورت پیدا ہو
الى الراوى و بين	کہ یا تو کذب کی نسبت راوی کی طرف
نسبته الى الخليل	جائے یا ابراہیم خلیل اللہؑ کی طرف
عليه السلام كان	اس کا انتساب کیا جائے تو بالکل کھلی
من المعلوم بالضرورة	ہوئی اور بدیہی بات ہے کہ راوی کی
ان نسبته الى الراوى	طرف اس کا انتساب کیا جانا زیادہ بہتر
اولیٰ[1]	اور مناسب ہوگا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی امام ممدوح دوسری رائے کا تذکرہ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ:

لم لا يجوز ان يكون المراد	ایسا کیوں نہیں ہوسکتا ہے کہ اس کے
بكونه كذبًا خبرًا	کذب ہونے کا مطلب ہو کہ ایسی خبر

---

[1] مفاتیح الغیب: ۷/۱۴۵۔ مطبعہ عامرہ (مصر) ۱۳۰۸ھ۔

شبیھًا بالکذب [1] جو کذب سے مشابہ اور اس کی ہم صورت ہو۔

بخاری و مسلم میں اس روایت کا تذکرہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے احوال اور ان کے فضائل و مناقب کے بیان میں ہے۔ صحیحین میں دوسرے موقع پر اس روایت کا تذکرہ روزِ محشر شفاعت کے بیان میں ہے [2] جب کہ دوسرے تمام انبیاء بربنائے تواضع اپنی بعض کمزوریوں کا تذکرہ کر کے اس سے اپنی عدمِ اہلیت ظاہر کرتے ہوئے اس کے معاملے کو آخری پیغمبر سیدنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف محول کریں گے۔ روایت کا یہ پس منظر خود بتاتا ہے کہ دیگر انبیاء کی طرح سیدنا ابراہیمؑ بھی بربنائے تواضع دعوتی مصالح اور سخت حالات کے باوجود اپنی تعریض و توریہ کو اپنے بلند مقامِ عبدیت کی مناسبت سے 'کذب' سے تعبیر کرتے ہیں۔★

علامہ فراہیؒ نے دوسری حدیث جو حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے پیش کی ہے۔ اس میں

---

[1] مفاتیح الغیب: ۷/۱۴۵۔ مطبعہ عامرہ (مصر) ۱۳۰۸ھ۔

[2] بخاری جلد ۲۔ کتاب الرقاق، باب صفۃ الجنۃ والنار، مسلم جلد ۱۔ کتاب الایمان، باب اثبات الشفاعۃ واخراج الموحدین من النار۔

★ یہ تاویل روایت کے پس منظر سے قطعی مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ روایت کے لحاظ سے حضرت ابراہیمؑ کا اللہ تعالیٰ کے حضور بندوں کی شفاعت کے لیے جانے کی ہمت نہ کر سکنا اپنے جھوٹ پر خدا کی ناراضگی کے خوف اور پشیمانی کے احساس ہی کے تحت ہو سکتا ہے نہ کہ بربنائے تواضع وغیرہ جیسا کہ صاحبِ مقالہ کا گمان ہے۔ ان کی یہ توجیہ کہ حضرت ابراہیمؑ "اپنی تعریض و توریہ کو اپنے بلند مقامِ عبدیت کی مناسبت سے کذب سے تعبیر کرتے ہیں" صحیح نہیں ہو سکتی، اس وجہ سے کہ بخاری ہی کی ایک حدیث میں جو باب "اتخذ اللہ ابراھیم خلیلا" میں ہے حضرت ابراہیمؑ نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: لم یکذب ابراھیم الا ثلاثًا۔ "توریہ" سے حضرت ابراہیمؑ کے قرآن میں مندرج اقوال کی تاویل تو ہو سکتی ہے (گرچہ بہتر یہ ہے کہ انھیں حجت کے حکم میں داخل سمجھا جائے جو اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا کی تھی) لیکن مذکورہ احادیث میں اس کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اگر یہ توریہ ہے تو ناقابلِ ذکر ہے کجا یہ کہ حضرت ابراہیمؑ اس کی وجہ سے روزِ حشر عاجز و بے بس نظر آئیں۔

سورج کے حق سبحانہ و تعالیٰ کے عرش تلے سجدہ کرنے کا ذکر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو آیت کریمہ "والشمس تجری لمستقر لھا (یٰسٓ: ۳۸) کی تفسیر قرار دیتے ہیں۔ مولانا نے اس موقع پر روایت کے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ بخاری شریف کتاب التفسیر کے ہیں [1] بخاری شریف میں یہ روایت اس سے قبل و بعد دو مواقع پر مزید آئی ہے [2] امام مسلم نے اسے اپنے یہاں کتاب الایمان میں نقل کیا ہے [3] علامہ فراہی نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد آگے بیاض چھوڑی ہے اور کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔ غالباً علامہ کا اعتراض حدیث کے الفاظ "مستقرھا تحت العرش" پر ہے جسے وہ مذکورہ آیت کریمہ میں "لمستقر لھا" کی تفسیر ماننے کے لیے تیار نہیں★۔ غالباً اس مستقر سے وہ 'اجل' مراد لیتے ہیں اور آیت بالا کو ان آیات کے ہم معنی قرار دیتے

---

[1] بخاری جلد ۲۔ کتاب التفسیر، باب قول والشمس تجری لمستقر لھا الخ۔

[2] بخاری جلد ۱۔ کتاب بدء الخلق، باب صفۃ الشمس والقمر بحسبان، جلد ۲۔ کتاب الرد علی الجھمیۃ، باب قولہ وکان عرشہ علی الماء۔

[3] مسلم جلد ۱۔ کتاب الایمان، باب بیان الزمن الذی لایقبل فیہ الایمان۔

★ جس حدیث کے آگے مولانا نے بیاض چھوڑی ہے صاحبِ مقالہ نے اسے نقل نہیں کیا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: قال (ابوذرؓ) کنت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المسجد عند غروب الشمس، فقال یا اباذر أتدری این تغرب الشمس؟ قلت اللہ ورسولہ اعلم، قال فانھا تذھب حتی تسجد تحت العرش فذلک قولہ تعالیٰ "والشمس تجری لمستقر لھا" ص ۳۳۔ بخاری کی اس حدیث میں آیت "والشمس تجری لمستقر لھا" کی تفسیر سورج کے تحت العرش جا کر غروب ہونے سے کی گئی ہے، اور ماقبل کی حدیث میں "مستقرھا تحت العرش" سے کی گئی ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک اور حدیث کا ذکر صاحبِ مقالہ نے کیا ہے جو غروب کے بعد سورج کے دوبارہ طلوع کی اجازت سے متعلق ہے۔ ان احادیث سے باعتبار مجموعی جو منظر اُبھر کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ سورج کا طلوع و غروب اس کے ایاب و ذہاب یا اس کی اپنی گردش کی وجہ سے ہے نہ کہ زمین کی گردش سے مولانا کا نقطۂ اعتراض اسی پہلو سے معلوم ہوتا ہے نہ کہ جو کچھ صاحبِ مقالہ نے "غالباً" کے خانہ میں رکھا ہے اُس پہلو سے۔

ہیں جن میں سورج اور چاند کے ایک متعین مدت تک چلتے رہنے کا تذکرہ ہے: کل یجری لاجل مسمی۔[1] حالانکہ بخاری کتاب بدأ الخلق اور مسلم کتاب الایمان کی روایات میں اس کی جو تفصیل مذکور ہے وہ خود اپنے اندر 'مستقر' کے اس مفہوم کو سمیٹے ہوئے ہے۔ جس میں کہا گیا ہے سورج عرش الٰہی کے نیچے سجدہ کرتے ہوئے ایک وقت تک تو دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت پاتا رہے گا★★ لیکن ایک مرحلہ وہ آئے گا جب کہ اس کا سجدہ شرف باریابی سے محروم ہوگا اور اسے دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت سے محروم ہو کر جہاں سے آیا تھا اسے پھر وہیں لوٹ جانے کے لیے کہا جائے گا جس کے بعد وہ بجائے مشرق سے مغرب سے ہی طلوع ہوگا۔ اور دوسری صحیح حدیث نبویؐ کے بموجب یہ قرب قیامت کی علامت ہوگی[2]

اس حدیث کا یہ انداز صاف بتا رہا ہے کہ یہ غیب کے وہ حقائق ہیں جنھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اشارۂ غیبی سے ہی ظاہر فرما سکتے ہیں۔ قرآن میں اگر سائے کے سجدہ کرنے کا تذکرہ ہے جس کی مناسب توجیہ کی جاتی ہے تو سورج کے عرش الٰہی کے سجدہ کرنے کی توجیہ کیوں نہیں کی جا سکتی ہے؟★★★۔

حدیث کے موضوع پر مولانا فراہی نے "فاتحہ نظام القرآن" اور "التکمیل فی اصول التاویل" کے علاوہ بعض دوسری تصانیف میں بھی گفتگو کی ہے۔ جب تک ان سب کو پیش نظر نہ رکھا جائے اس وقت تک ان کے موقف کو ٹھیک طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔ مثلاً احکام الاصول میں وہ سنت کو

---

[1] رعد: ۲، لقمان: ۲۹، فاطر: ۱۳، زمر: ۵۔

★ "مستقر" کی جو تفسیر صاحب مقالہ نے بیان کی وہ مولانا کی نہیں خود ان کی ہے۔ اس ضمن میں مولانا نے کچھ لکھا ہو اس کا علم مرتب کو نہیں۔

★★ دوبارہ طلوع ہونے کا کیا مطلب؟

[2] بخاری جلد ۲۔ کتاب الفتن۔ مسلم جلد ۲۔ کتاب الفتن واشراط الساعۃ، ص ۳۹۲

★★★ مسئلہ تحت العرش سجود شمس کا نہیں ہے بلکہ غروب کے لیے وہاں اس کے چل کر جانے اور پھر طلوع کے لیے مشرق کی طرف واپسی کا ہے۔

شریعت کا ایک مستقل ماخذ قرار دیتے ہیں، جس کے مضمرات کو کھول دیا جائے تو جمہور امت سے ان کا سارا اختلاف کافور ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر ترجمان القرآن کے الفاظ نقل کرنا مناسب ہے:

والقسم الثالث ما لا نجده فی الکتاب ولکن الزیادۃ محتملۃ فجعلنا السنۃ فیہ اصلاً مستقلاً فان اللہ تعالیٰ أمرنا عموماً باطاعۃ الرسول وأمر الرسول بالحکم بما یرید اللہ تعالیٰ سواء کان بالکتاب او بالنور والحکمۃ التی ملأ اللہ بہا قلبہ[1]

تیسری قسم وہ ہے جسے ہم کتاب اللہ میں نہیں پاتے، لیکن اس زیادتی کا وہ پوری طرح تحمل کر سکتی ہے۔ تو اس معاملے میں ہم نے سنت کو ایک مستقل اصل مانا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو علی الاطلاق رسول کی پیروی کا حکم دیا ہے اور رسولؐ کو حکم دیا ہے کہ وہ لوگوں کے لیے اس چیز کا حکم کرے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہو۔ خواہ وہ اس کی کتاب کے ذریعہ ہو یا اس نور اور حکمت کے ذریعہ جس سے کہ اس نے اس کے سینے کو بھر رکھا ہے۔

اس پوری گفتگو میں ترجمان القرآن فراہی کا اصل مذاق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ احادیث کو قرآن سے مستنبط سمجھتے ہیں، اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ حضرت امام شافعیؒ آج سے بہت پہلے فرما چکے ہیں کہ:

کل ما حکم بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فھو مما فہمہ من القرآن۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (جملہ معاملات زندگی سے متعلق) جو کوئی فیصلہ بھی کیا ہے تو وہ وہی ہے جو قرآن سے ان کا سمجھا ہوا ہے۔

---

[1] احکام الاصول

[2] فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۳/۳۶۳، نیز الاتقان فی علوم القرآن: ۲/۱۲۶

ترجمان القرآن کا یہی مسلک ہے جس کا انھوں نے اپنے مقدمہ تفسیر میں حوالہ بھی دیا ہے۔

اس طرح اصول کی حد تک ترجمان القرآن کا سلف سے اختلاف نہیں۔ یہ اختلاف بس جزئیات کا ہے جس کی نظیریں سلف کے یہاں بھی موجود ہیں[1]

اس پہلو سے ترجمان القرآن فراہی کے تعمق کی ایک اچھی مثال آیت میراث میں وصیت کا مسئلہ ہے۔ ان کی اس رائے کو انہی کے الفاظ میں دیکھنا چاہیے۔ کتاب 'التکمیل' میں "هل يأول الحديث الى القرآن أم يعكس الأمر؟ (کیا حدیث کی تاویل قرآن کی روشنی میں کی جائے یا معاملہ اس کے برعکس ہوگا) کے تحت فرماتے ہیں:

کم من آیات القرآن ان تدبرت فیها وفهمت معناها وجدت من الاحادیث ماجاء موافقا له۔ فالحدیث لم یزد شیئا علی القرآن۔ ولکن صرح به من الآیة أمرا غامضا یکاد یخفی علی من لا یتدبر۔ مثلاً فی آیة المیراث تری وصیتین: وصیة من الله وسماها فریضة من الله۔ وقال فیها: "آباؤکم وابناؤکم لا تدرون أیهم اقرب لکم نفعًا فریضة من الله ان الله کان علیمًا حکیمًا"۔[1] ووصیة اخری من المیت وجعل التقدم لوصیة المیت۔ وقد علمنا أن الله اعلم واحکم ووصیته اقدم، فلابد أن تکون هذه وصیة المیت لغیر وارثیه من الخیرات، ثم تری النبی علیه الصلوات صرح بذلك فقال: "ألا لا وصیة لوارث"۔[2]

قرآن کی کتنی ہی آیتیں ہیں کہ اگر تم ان پر غور کرو اور ان کے معنی کو سمجھ لو تو احادیث سے تم کو وہ چیز مل جائے گی جو اس کے موافق ہوگی۔ چنانچہ حدیث قرآن پر کوئی اضافہ نہ کرے گی۔ بلکہ وہ آیت قرآنی کے کسی باریک پہلو کی نشاندہی کرے گی جس کا اس شخص پر پوشیدہ رہ جانا عین قرین قیاس ہے جو فہم و تدبر کا حق ادا نہ کر سکے۔ مثال کے طور پر آیت میراث کے اندر تم کو دو طرح کی وصیتیں نظر آئیں گی۔ اللہ کی طرف سے وصیت، جسے وحی الٰہی نے فریضۃ من اللہ کہا اور جس کے بارے میں ارشاد ہوا: "تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمھارے لیے نفع رسانی کے لحاظ سے قریب تر ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ فریضہ ہے۔ بیشک اللہ بڑا جاننے والا، حکمت والا ہے"۔ اور دوسری، وصیت میت کی طرف سے ہے، اور میت کی وصیت کو مقدم کیا گیا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ اللہ سب سے بڑھ کر علم رکھنے والا اور حکمت والا ہے۔ چنانچہ اس کی وصیت بھی دوسروں سے مقدم ہونی چاہیے۔ پس ضروری ہے کہ میت کی طرف سے بھلائی کے کاموں کی جو وصیت ہو وہ اس کے غیر وارثین کے حق میں ہو۔ اب تم دیکھو کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کی صراحت فرماتے ہیں، اشارہ ہوتا ہے: "سُن لو وارث کے حق میں وصیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے"۔

---

[1] مثال کے طور پر علامہ ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) جو صحیحین کی مختلف روایات کو روایت و درایت ہر دو پہلو سے نقد و نظر سے بالا نہیں سمجھتے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۸/۱۷-۲۱- (سعودی عرب) ترتیب: عبدالرحمٰن بن قاسم وابنہ محمد، بدون سنۃ۔

---

[1] سورہ نساء: ۱۱

[2] التکمیل فی اصول التاویل، ص ۶۵، مولانا اصلاحی حفظہ اللہ نے اپنی تفسیر تدبر قرآن میں آیاتِ میراث کی تفصیل میں چوتھے نکتے کی وضاحت میں بعینہٖ یہی بات کہی ہے۔ تدبر قرآن: ۲/۲۳- انجمن خدام القرآن، لاہور، طبع دوم ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء۔

اس گفتگو میں مولانا حدیث 'لا وصیة لوارث' کا ماخذ قرآن سے تلاش کرتے ہیں۔ دیکھنے کی بات ہے کہ خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی کے عدم جواز کے قائل امام محمد بن حسن شیبانی کو حضرت امام شافعیؒ بعض دیگر نظائر کے ساتھ حدیث بالا کے حوالے سے لاجواب کر دیتے ہیں جس سے آیت کریمہ: "کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت" الآیة۔ (بقرہ: ۱۸۰) پر اضافہ ہوتا ہے[1] لیکن امام فراہیؒ اس کی بنیاد کتاب اللہ ہی سے تلاش کر لیتے ہیں۔ اسی طرح احکام الاصول کی یادداشتوں میں بھی وہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ غیر وارثین کے لیے تہائی سے زیادہ کی وصیت کی ممانعت کی حدیث نبویؐ کا ماخذ کتاب اللہ سے ڈھونڈھ نکالتے ہیں[2]۔

ترجمان القرآن فراہی حدیث کے ذریعہ قرآن کے نسخ کے قائل نہیں۔ جس کے لیے انھوں نے اپنی تائید میں صاحب خانہ کی حیثیت سے حضرت امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا تذکرہ کیا ہے۔ شافعی اور حنبلی اصول فقہ میں اس کی صراحت ہے۔

ولا یجوز نسخ الکتاب بالسنة
ویجوز نسخ السنة بالکتاب و
یجوز نسخ المتواتر بالمتواتر ونسخ
الآحاد بالآحاد والمتواتر ولا یجوز
نسخ المتواتر بالآحاد[3]

کتاب کا نسخ سنت سے جائز نہیں ہے
ہاں سنت کا نسخ کتاب سے جائز ہے۔
اسی طرح خبر متواتر کا متواتر سے اور آحاد
کا آحاد سے نسخ جائز ہے۔ البتہ آحاد سے
متواتر کا نسخ جائز نہیں ہے۔

اسی طرح فقہ حنبلی میں ہے:

ویجوز نسخ القرآن
والسنة المتواترة

اور قرآن، سنت متواترہ اور آحاد میں
ایک دوسرے کا نسخ اپنے مثیل سے

---

[1] حجة اللہ البالغة: ۱۴۶/۱

[2] احکام الاصول (مخطوط)

[3] الورقات للجوینی مشمولہ مجموع متون اصولیہ/۵/۴۔ ابتدا میں متن کا حصہ مقلوب ہو گیا ہے جس کی محشی نے نشاندہی کر دی ہے۔ ہم نے اسی کو بحال کر دیا ہے۔ محشی نے حضرت امام شافعیؒ کے ساتھ امام احمد بن حنبلؒ کا بھی یہی مسلک قرار دیا ہے۔

والآحاد بمثلها
والسنة بالقرآن
لا هو بها[1]

جائز ہے۔ اسی طرح سنت کا نسخ قرآن سے
جائز ہے۔ اس کے برعکس قرآن کا نسخ
سنت سے جائز نہیں۔

قرآن کو معیار بنا کر حدیث اور روایت کو پرکھنے کے سلسلہ میں امام فراہیؒ کا اصل جوہر قرآنی تاریخ اور ارض القرآن کے میدان میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس کی مثال حضرت ہاجرہؑ کی حضرت سارہؑ کی خدمت گزاری اور سیدنا ابراہیمؑ کی طرف سے حضرت اسماعیلؑ کو شیرخواری کی عمر میں انتہائی بے کسی کے عالم میں سرزمین مکہ میں چھوڑ دینے کی روایات کے ضمن میں ملتی ہے — ترجمان القرآن فراہیؒ نے اپنی معرکۃ الآرا رسالے 'ذبیح' میں ان دو واقعات کی تردید اگرچہ پرزور دلائل سے کی ہے لیکن اس کی زد صحیح بخاری پر بھی پڑتی ہے جس میں ان روایات کا تذکرہ ایک سے زیادہ مقامات پر کیا گیا ہے۔

۱۔ صحیح بخاری میں حضرت ہاجرہؑ کی حضرت سارہؑ کی خدمت گزاری کا ذکر کذب ابراہیمؑ والی اس روایت میں بھی ہے جس کا حوالہ اس سے پہلے گزرا۔ اس کے مطابق ملک جبار نے حضرت سارہؑ کی کرامات سے ششدر ہو کر اپنی بیٹی ہاجرہؑ کو ان کی خدمت کے لیے دے دیا[2]۔

اس کے علاوہ بخاری شریف میں یہ روایت دوسرے مقامات پر بھی ہے[3] جہاں حضرت ہاجرہؑ کی حضرت سارہؑ کی خدمت گزاری کا یہ تذکرہ تقریباً انھی الفاظ میں مذکور ہے۔

۲۔ صحیح بخاری کی دوسری روایت سیدنا ابراہیمؑ کی طرف سے حضرت اسماعیلؑ کو شیرخواری کی عمر میں سرزمین مکہ میں بے یار و مددگار اپنی ماں ہاجرہ کے ساتھ تنہا چھوڑ آنے کی ہے۔ یہ ایک طویل روایت ہے۔ جس کا ابتدائی حصہ ہماری زیر نظر گفتگو سے متعلق ہے۔ اس کی عبارت ہے:

---

[1] قواعد الاصول و معاقد الفصول لصفی الدین البغدادی الحنبلی م ۷۳۹ھ مشمولہ مجموع متون اصولیہ، ص ۱۴۲

[2] بخاری جلد ۱۔ کتاب الانبیاء، باب قول اللہ عزوجل واتخذ اللہ ابراھیم خلیلاً۔

[3] بخاری جلد ۱۔ کتاب البیوع، باب شری المملوک من الحربی وھبتہ الخ۔ نیز کتاب مذکور، باب قبول الھدیہ من المشرکین۔

عن سعيد بن جبير قال ابن عباس اول ما اتخذ النساء المِنْطَق من قبل ام اسماعيل اتخذت مِنطقا لتعفى اثرها على سارة ثم جاء بها ابراهيم و بابنها اسماعيل وهى ترضعه حتى وضعهما عند البيت عند دوحة فوق زمزم فى اعلى المسجد وليس بمكة يومئذ أحد و ليس بها ماء فوضعهما هنالك و وضع عندهما جرابًا فيه تمر و سقاءً فيه ماء ثم قفى ابراهيم منطلقًا فتبعته أم اسماعيل فقالت يا ابراهيم

حضرت سعید بن جبیر (تابعی م ۹۵ھ)[1] سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ سب سے پہلے عورتوں نے جو کمر بند باندھنا سیکھا تو وہ حضرت اسماعیلؑ کی ماں سے سیکھا جنھوں نے کمر بند اس مقصد سے باندھا کہ (اس کے سہارے لمبے غرارے یا سایے کے ذریعہ) اپنے نقوشِ پا کو مٹا سکیں جس کی وجہ سے حضرت سارہ ان کا پیچھا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ پھر ایسا ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ انھیں اور ان کے بیٹے اسماعیلؑ کو لے کر آئے یہاں تک کہ انھیں خانۂ کعبہ کے پاس چاہِ زمزم کے بالائی حصے میں ایک بڑے درخت کے نیچے لاکر ڈال دیا۔ ان دنوں مکہ میں کوئی آدمی آدم زاد نہ تھا اور نہ وہاں پانی کا کوئی سراغ تھا۔ تو انھوں نے ان دونوں کو وہاں لاکر ڈال دیا اور ان کے پاس ایک تھیلا رکھ دیا جس میں کھجوریں تھیں، اور ایک مشکیزہ جس میں پانی تھا۔ اس کے بعد ابراہیمؑ اُلٹے پاؤں

---

[1] حجاج بن یوسف نے آپ کو شعبان ۹۵ھ میں قتل کرا دیا تھا جب کہ آپ کی عمر کل انچاس سال تھی۔ الاکمال فی اسماء الرجال للخطیب التبریزی صاحب المشکوٰۃ ملحقا بآخر المشکوٰۃ، کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔ بدون سنۃ

اين تذهب وتتركنا فى هذا الوادى الذى ليس فيه أنيس ولا شيئ فقالت له ذٰلك مرارا وجعل لايلتفت اليها فقالت له آللّٰه امرك بهٰذا قال نعم قالت اذن لا يضيعنا ثم رجعت ـ الخ [1]

واپس جانے لگے تو اسماعیلؑ کی ماں ان کے پیچھے ہولیں، اور پوچھا اے ابراہیمؑ! ہم لوگوں کو اس وادی میں چھوڑ کر آپ کہاں جا رہے ہیں، جہاں نہ کوئی ہمدم و ہمراز ہے، نہ کہیں کسی چیز کا پتہ ہے؟۔ انھوں نے ان سے یہ بات کئی بار کہی، لیکن ان کا حال تھا کہ وہ مُڑ کر دیکھنے کو تیار نہ تھے۔ اس پر انھوں نے ان سے کہا کہ کیا ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ انھوں نے کہا ہاں! ۔ اس پر انھوں نے کہا پھر تو کوئی بات نہیں۔ وہ ہمیں ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اس کے بعد وہ واپس گئیں۔

اسی باب میں اس سے قبل حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی مختصر روایت سعید بن جبیرؒ کے واسطے سے ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے:

قال اقبل ابراهيم باسماعيل و امه وهى ترضعه معها شنة ـ [2]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور ان کی ماں کو لے کر جس وقت (مکہ) آئے تو وہ انھیں دودھ پلا رہی تھیں اور ان کے ساتھ ایک مشکیزہ تھا۔

---

[1] بخاری جلد ۱۔ کتاب الانبیاء، باب یزفون النسلان فی المشی۔

[2] ایضاً۔

صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں حضرت ہاجرہؑ سے حضرت سارہؑ کی رقابت اور اس کے نتیجے میں سیدنا ابراہیمؑ کی اول الذکر کی اپنے بیٹے کے ساتھ مہاجرت کی مزید تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس کو بھی ہم اس کے اصل الفاظ میں ہی نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں:

وکان السبب فی ذٰلک ان سارة کانت وھبت ھاجرة لابراھیم فحملت منه باسماعیل فلما ولدته غارت منھا فحلفت لتقطعن منھا ثلاثة اعضاء فاتخذت ھاجر منطقا فشدت به وسطھا وھربت وجرت ذیلھا لتخفی اثرھا علیٰ سارة۔[1]

اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت سارہؑ نے حضرت ہاجرہؑ کو حضرت ابراہیمؑ کے لیے دے دیا تھا، تو ان سے ان کے ہاں اسماعیلؑ حمل میں ٹھہرے۔ تو جب ان کے ہاں ان کی پیدائش ہوئی تو سارہؑ کو ان سے رشک ہوا۔ چنانچہ انھوں نے قسم کھالی کہ وہ ان کے جسم کے تین اعضاء کاٹے بغیر نہ رہیں گی۔ اس سے بچنے کے لیے ہاجرہؑ نے ایک کمر بند تیار کیا اور اس سے اپنی کمر باندھ لی۔ اس کے بعد وہ بھاگ نکلیں اور (کمر بند سے بندھے) اپنے (لمبے) دامن کو وہ اپنے پیچھے گھسیٹتی رہیں جس سے کہ ان کے نشانِ پا سارہؑ کو نظر نہ آسکیں۔

تیسری روایت میں تنہا اسی واقعے کو سیدنا ابراہیمؑ کی اس مہاجرت کی وجہ قرار دیا گیا ہے۔[2]

اس سلسلے کی آخری روایت جو مجاہد اور دوسرے لوگوں سے ہے اس میں اس واقعے کی تفصیل تو اس سے مختلف ہے، لیکن سیدنا اسماعیلؑ کے شیر خواری میں مکہ پہنچنے کا تذکرہ اس میں بھی اسی طرح موجود ہے۔[2]

---

[1] فتح الباری شرح صحیح البخاری: ۶/ ۲۵۱، مطبعہ خیریہ، مصر ۱۳۲۵ھ، طبعہ اولیٰ

[2] ایضاً۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر صحیح بخاری اور اس کی شرح کے ساتھ اس سلسلے میں توراۃ کے بیان پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ کتاب مقدس، پرانے عہد نامے کی کتاب پیدائش کے اکیسویں باب میں ہے:

"تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا بلکہ اسے ان کے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اس کے حوالہ کر کے اسے رخصت کر دیا۔ سو وہ چلی گئی اور بیر سبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی ۝ اور جب مشک کا پانی ختم ہو گیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا ۝ اور آپ اس کے مقابل دور ایک تیر کے ٹپے پر جا بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں۔ سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی اور چلا چلا کر رونے لگی اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے اس کی آواز سن لی ہے ۝ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کیونکہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا ۝"[1]

اسی کے ساتھ ہی کتاب پیدائش کے باب ۱۶ کے مضمون پر بھی ایک نظر ڈالنی مناسب ہے جس سے صحیح بخاری میں مذکور حضرت ہاجرہ کی حضرت سارہ کی خدمت گزاری کی تفصیل سامنے آتی ہے:

"اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا ۝ اور ساری نے ابرام سے کہا کہ دیکھ خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے سو تو میری لونڈی کے پاس جا شاید اس سے میرا گھر آباد ہو اور ابرام نے ساری کی بات مانی اور ابرام کو ملک کنعان میں رہتے رہتے دس برس ہو گئے تھے جب اس کی بیوی ساری نے اپنی مصری لونڈی اسے دی کہ اس کی بیوی بنے ۝ اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ حاملہ

---

[1] کتاب مقدس، پرانا عہد نامہ پیدائش باب ۲۱: ۱۴-۱۸

ہو گئی تو اپنی بی بی کو حقیر جاننے لگی۔ تب ساری نے ابرام سے کہا کہ جو ظلم مجھ پر ہوا وہ تیری گردن پر ہے۔ میں نے اپنی لونڈی تیری آغوش میں دی اور اب جو اس نے آپ کو حاملہ دیکھا تو میں اس کی نظروں میں حقیر ہو گئی۔ سو خداوند میرے اور تیرے درمیان انصاف کرے ○ ابرام نے ساری سے کہا کہ تیری لونڈی تیرے ہاتھ میں ہے جو تجھے بھلا دکھائی دے تو اس کے ساتھ کر۔ تب ساری اس پر سختی کرنے لگی اور وہ اس کے پاس سے بھاگ گئی ○ اور وہ خداوند کے فرشتہ کو بیابان میں پانی کے ایک چشمہ کے پاس ملی۔ یہ وہی چشمہ ہے جو شور کی راہ پر ہے ○ اور اس نے کہا اے ساری کی لونڈی ہاجرہ تو کہاں سے آئی اور کدھر جاتی ہے؟ اس نے کہا میں اپنی بی بی ساری کے پاس سے بھاگ آئی ہوں ○ خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا تو اپنی بی بی کے پاس لوٹ جا اور اپنے کو اسی کے قبضہ میں کر دے۔ اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا یہاں تک کہ کثرت کے سبب سے ان کا شمار نہ ہو سکے گا ○ اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا ہوگا۔ اس کا نام اسماعیل رکھنا اس لیے کہ خداوند نے تیرا دکھ سن لیا ○ وہ گورخر کی طرح مرد آزاد ہوگا۔ اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا۔[1]

عہد نامہ قدیم کی ان تفصیلات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صحیح بخاری اور اس کی شرح کے حوالہ سے سیدنا اسماعیلؑ اور ان کی ماں ہاجرہؓ کی نسبت سے بعض جزئیات اور اجمال و تفصیل کے فرق کے علاوہ ان کے اور کتاب مقدس کے مذکورہ بیانات میں کوئی بنیادی فرق نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور تو اور اس بیان میں ابرام کے ساتھ خدا کا فرشتہ بھی حضرت سارہ کا ہم زبان ہو جاتا ہے۔ ترجمان القرآن فراہیؒ اپنے معرکۃ الآرا رسالے "الرأی الصحیح فی من ھو الذبیح" میں تورات کے حوالہ سے ان دونوں واقعات کی تردید ایک ساتھ کرتے ہیں:

---

[1] پیدائش باب ۱۶۔ آیات: ۱-۱۲

"یہود نے صرف اسی پر بس نہیں کیا کہ حضرت اسماعیل کو اس شرف عظیم[1] سے محروم کر دینا چاہا بلکہ تورات میں یہ بھی لکھ دیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو ان کی ماں کے ساتھ گھر سے باہر نکال دیا اور یہ کہ ان کی ماں حضرت ہاجرہ حضرت اسحاقؑ کی والدہ حضرت سارہ کی لونڈی تھیں۔ اس جھوٹ اور اس توہین کا وبال اگرچہ یہود کے سر پڑ آیا اور ان کو مصر کی غلامی اور ذلت و مسکنت کی ایک طویل آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن آباء و اجداد کا گھمنڈ اس طرح ان کی گھٹی میں پڑا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بار بار کی تنبیہ کے باوجود یہ ان کے اندر سے نہ نکل سکا۔"[2]

اسی رسالے میں آگے دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

"تیسرا عظیم الشان وہ فتنہ ہے جو انھوں نے حضرت اسماعیلؑ اور ان کے اخراج سے متعلق گڑھا کہ چونکہ حضرت سارہؓ حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ سے نفرت کرتی تھیں، ان کی خواہش یہ تھی کہ حضرت اسماعیلؑ حضرت اسحاقؑ کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کی وراثت میں شریک نہ ہوں، اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ کو فاران کے بیابان کی طرف نکال دیا۔ حالانکہ یہ واقعہ جس صورت میں ان کے صحیفوں میں بیان ہوا ہے، اس میں اس قدر کھلا تضاد موجود ہے کہ ہر صاحب نظر اس کو بالکل لغو قصہ خیال کرنے پر مجبور ہے اور اس زمانہ میں تو خود ان کے اپنے اندر کے بہت سے ناقدین نے اس کی لغویت کا اعتراف کر لیا ہے۔"[3]

---

[1] شرف عظیم یعنی حضرت اسحاقؑ کے بجائے سیدنا اسماعیل کا ذبیح ہونا۔

[2] اردو ترجمہ 'الرأی الصحیح' از مولانا امین احسن اصلاحی، 'ذبیح کون ہے؟' ص ۸۔۱۱، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ۔ کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی، طبع اول۔ اس موقع پر یہود کی غلامی کی بابت علامہ نے اپنی تفسیر سورہ فیل کا حوالہ دیا ہے۔ مولانا اصلاحی کے ترجمہ تفسیر سورہ فیل میں اس کی تفصیل ص ۳۲، ۳۴ پر ہے۔ اسی موقع پر سیدنا اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہؓ کے متعلق یہود کی مذکورہ تحریفات کا حوالہ بھی ہے۔ تفسیر سورۂ فیل تالیف استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی، ص ۳۲-۳۴، دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ۔ مطبوعہ کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی

[3] ذبیح کون ہے؟، ص ۱۳۷

اس سلسلے میں جہاں تک صحیح بخاری کی حضرت ہاجرہؑ کی حضرت سارہؑ کی خدمت گزاری والی روایت ہے، اس میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ تورات کی طرح بخاری کی اس روایت میں بھی سیدنا ابراہیمؑ کے مقابلے میں حضرت سارہؑ کی شخصیت اُبھری ہوئی ہے۔ فرعون مصر یا ملک جبار حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ حضرت سارہؑ کی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے اور ان سے اس کی عقیدت مندی اس انتہا کو پہنچتی ہے کہ کہاں تو وہ ان کی عزّت سے کھیلنا چاہتا تھا اور کہاں دوسری روایت کے مطابق ان کی خدمت گزاری کے لیے اپنی بیٹی کو ان کے حوالہ کر دیتا ہے[1]۔ جب کہ ایک اور روایت کے مطابق حضرت سارہؑ کی کرامات کو دیکھ کر شاہ مصر یہ تک کہہ دیتا ہے کہ میری بیٹی کا اس کے گھر میں لونڈی بن کر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ بن کر رہنے سے بہتر ہے[2]۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ اسی روایت کے حوالہ سے صحیح بخاری کی حدیث مذکور کو نبھانے کی خاطر اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ "بڑی بیوی ہونے کی حیثیت سے حضرت ہاجرہؑ حضرت سارہؑ کی خدمت گزار تھیں[3]"۔ اس کے ساتھ ہی وہ بخاری کی حدیث بالا کا حوالہ دیتے ہیں: "اور یہ خود ہماری حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے۔"[4]

ایسی صورت میں ایک جلیل القدر پیغمبر کا اس ظلم کی سرپرستی کرنا کہ اس کی چھوٹی بیوی بڑی بیوی کی خدمت گزار ہو، یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ یہود نے تو حضرت ہاجرہؑ کو باقاعدہ حضرت سارہؑ کی باندی بنا دیا۔ اور بات اس قدر آگے بڑھی کہ ہمارے بزرگوں کو دفاعی پوزیشن میں آکر حضرت ہاجرہؑ کی آزادی کے دلائل کو زور و قوت کے ساتھ پیش کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑا[5]۔ سوال یہ ہے کہ اگر حضرت ہاجرہؑ حضرت سارہؑ کی خادمہ اور دوسرے

---

[1] مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ: قصص القرآن، ۱/۲۱۲، ندوۃ المصنفین، دہلی، طبع جدید عکسی بار ہفتم ۱۹۸۶ء۔

[2] مولانا سید سلیمان ندویؒ، ارض القرآن، ۲/۴۱، دار المصنفین، اعظم گڑھ، طبع چہارم ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء۔

[3] ایضاً، [4] ایضاً

[5] اشارہ ہے مولانا عنایت رسول چریاکوٹی کے رسالے "النصوص الباهرة فی حرية هاجرة"

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لفظوں میں ان کی باندی تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صحیح حدیث کی کیا توجیہ کی جا سکتی ہے کہ:

انا سید ولد آدم یوم القیامة ولا فخر[1]

میں روزِ قیامت تمام اولادِ آدمؑ کا سردار ہوں گا۔ اور یہ حقیقت ہے اس میں فخر و مباہات کی کوئی بات نہیں۔

دوسری روایات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سرداری اور عالی نسبی کی مزید صراحت ہے۔ صحیح مسلم میں ہے:

ان اللہ اصطفٰی من ولد ابراهیم اسماعیل، واصطفٰی من بنی اسماعیل بنی کنانة، واصطفٰی من بنی کنانة قریشًا، واصطفٰی من قریش بنی هاشم، واصطفانی من بنی هاشم[2]۔

اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیمؑ سے حضرت اسماعیلؑ کو چُنا اور بنی اسماعیلؑ سے بنی کنانہ کو چُنا اور بنی کنانہ سے قریش کو چُنا اور قریش سے بنی ہاشم کو چُنا اور مجھ کو بنی ہاشم میں سے چیدہ قرار دیا۔

اس مضمون کی روایات بکثرت ہیں[3]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کی طرف جس کا حوالہ مولانا سید سلیمان ندوی نے ارض القرآن اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے قصص القرآن میں دیا ہے۔ ارض: ۲/۴۰۔ قصص: ۱/۲۱۳۔ البتہ قصص القرآن میں اس کا نام 'النصوص' کے بجائے 'البراهين الباهرة' الخ۔ اسی طرح مصنف کا نام بجائے عنایت رسول' کے 'غلام رسول' لکھا ہے۔ قصص القرآن، حوالہ سابق۔ افسوس کہ علی گڑھ میں یہ رسالہ ہم کو دستیاب نہ ہو سکا جس سے رسالے اور مصنف کے نام کی تصدیق ہو سکتی۔

[1] السیرة النبویة لابن کثیر الدمشقی م ۷۷۴ھ: ۲/۱۹۴، دار المعرفة، بیروت ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء۔ تحقیق: مصطفیٰ عبد الواحد۔

[2] ایضاً، ۲/۱۹۱۔

[3] مثال کے طور پر دیکھئے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ایک طویل روایت کا آخری ٹکڑا جس کی روایت حاکم اور بیہقی نے کی ہے۔ حوالہ مذکور ۲/۱۹۳-۱۹۴

حاکم اور بیہقی کی حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صاف لفظوں میں فرماتے ہیں:

قال لی جبریل : قلّبت الأرض من مشارقها ومغاربها فلم اجد رجلاً افضل من محمّدؐ، وقلّبت الأرض مشارقها ومغاربها فلم اجد بنی اب افضل من بنی هاشم[1]	مجھ سے جبریلؑ نے صاف کہا: میں نے روئے زمین کو مشرق سے مغرب تک پلٹ کر دیکھ لیا تو مجھ کو محمدؐ سے بڑھ کر کوئی دوسرا شخص نہ ملا۔ اور میں نے روئے زمین کو مشرق سے مغرب تک پلٹ کر دیکھ لیا تو میں نے کسی خانوادے کو بنی ہاشم سے بڑھ کر نہیں پایا۔

ترجمان القرآن فراہی صحیح بخاری کی مذکورہ روایت کے حوالہ کے بغیر سیدنا ابراہیمؑ کے حالات کے بیان میں حضرت ہاجرہؑ کے حضرت سارہ کی خدمت گزار بنانے کے بجائے سیدنا ابراہیمؑ کی خدمت میں پیش کیے جانے کا تذکرہ کرتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ انھیں حضرت ہاجرہؑ کی جناب سارہؑ کی خدمت گزاری منظور نہیں۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ بابل سے روانگی کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ نے کنعان میں قیام کیا تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ان کے یہاں بھیڑ بکریوں اور نوکروں چاکروں کی بڑی افزائش ہوئی اور وہ ایک دولت مند رئیس بن گئے۔ یہیں ایک میدان میں اس نواح کے ایک عرب سردار ابوملک نے آپ کو اپنا خلیفہ بنایا اور حضرت ہاجرہؑ کو آپ کی خدمت میں حوالہ کیا۔[2] صحیح بخاری کا استناد اپنی جگہ مسلم اور روایات کی جانچ پرکھ اور ان کے راویوں کے عدل و ثقاہت کی بات اپنے آپ میں تسلیم لیکن اوپر کی تفصیلات کی روشنی میں دل چاہتا ہے کہ شاذ و نادر مقامات میں کسی راوی کے سہو و نسیان اور

---

[1] حوالہ سابق، ۲/۱۹۴

[2] رسالہ "آنحضرتؐ کا سلسلۂ نسب اور اہلِ کتاب"، ص ۱۴، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، بار اول ۱۹۹۱ء۔ علامہ کا یہ رسالہ تحقیق کا ایک مستقل موضوع بن سکتا ہے۔

اس کی نادانستہ غلط فہمی و غلط نظری کے امکان کو اس کے اندر تسلیم کیا جائے۔

۲۔ سیدنا اسماعیلؑ کی شیرخواری والی صحیح بخاری کی دوسری روایت اس سے بھی زیادہ اپنے ساتھ پیچیدگیاں اور دشواریاں لیے ہوئے ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن میں حضرت سارہؑ کے مومنہ ہونے کی صراحت نہیں۔ لیکن مختلف مقامات پر ان کا تذکرہ اس نے جس انداز سے کیا ہے، خاص طور پر فرشتوں سے ان کی ہمکلامی کا جو تذکرہ سورۂ ہود اور سورۂ ذاریات میں[1] ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ صرف مومنہ ہی نہیں بلکہ انتہائی نیک و صالح اور اپنے شوہر کی وفاشعار اور فرماں بردار خاتون تھیں۔ یہ تسلیم کہ سوکنوں میں باہمی غیرت اور چشمک فطری ہے اس نسبت سے حضرت ہاجرہؑ کے ان سے پہلے صاحب اولاد ہو جانے کی صورت میں اس غیرت و رقابت کا کچھ مزید بڑھ جانا بھی مستبعد نہیں، لیکن اس غیرت و رقابت کا علانیہ دشمنی اور عداوت میں تبدیل ہو جانا اس طور پر کہ انھیں اپنی سوکن کی صورت دیکھنا بھی گوارہ نہ ہو، اور اسے ملک بدر کیے بغیر انھیں کسی طرح چین نہ آئے، شقاوت قلبی اس درجہ بڑھے کہ سوکن کے ساتھ اس کے معصوم شیرخوار بچے پر بھی کچھ رحم نہ آئے، یہاں تک کہ جاتے وقت انھیں سیدھے طریقے سے جانے بھی نہ دیں اور انھیں مارتے پیٹتے بھاگنے کے لیے مجبور کریں بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر اپنی سوکن کے اعضا کو کاٹنے کی قسم کھالیں، اور بیوی کو ان مظالم کا نشانہ بنتے دیکھنے کے باوجود، محض اس کے تماشائی بنے رہنے سے سیدنا حضرت ابراہیمؑ کی جو کردارکشی ہوتی ہے صرف اس لیے کہ حضرت سارہؑ کی اس سے عزت افزائی ہو رہی ہے یقیناً اس سے صرف یہود کو ہی خوشی ہو سکتی ہے۔ روایت کے اس پہلو سے قطع نظر سیدنا ابراہیمؑ کا اپنے چہیتے اور اکلوتے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کو مکہ کی سرزمین میں اپنی ماں کے ساتھ یکہ و تنہا چھوڑ کر چلے آنا، ان کی 'حلیم داداہ' کی صفات سے مغایر اور عقل عام کے خلاف ہونے کے ساتھ، سورہ صافات کی آیت کریمہ کے الفاظ:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ۔ (آیت: ۱۰۲)	تو جب اسماعیلؑ اپنے باپ کے ساتھ رہتے ہوئے دوڑنے کی عمر کو پہنچ گئے۔

سے اس کا صریحی ٹکراؤ ہے۔ سیدنا اسماعیلؑ کی اپنے والدہ گرامی کی معیت میں پرورش کنعان

---

[1] سورۂ ہود: ۷۱، سورۂ ذاریات: ۲۹

یا بئرِ سبع میں ہوئی ہو،[1] یا ان کے کسی قدر سیانے ہو جانے کے بعد حضرت ابراہیم انھیں مکہ میں لائے ہوں اور ان کے ساتھ رہائش اختیار کرلی ہو، ان میں جو بھی صورت ہو، آیت کریمہ کے الفاظ "فلما بلغ معہ السعی" سے ہم کو اصرار ہے[2] کہ دوڑنے کی اس عمر تک حضرت اسماعیل اپنے والد گرامی کی معیت میں رہے اور شیر خوارگی کی عمر میں مکہ کی سرزمین میں باپ کے بغیر صرف ماں کے ساتھ پڑے رہنے کے بجائے سمجھداری کی اس عمر تک ان کی پرورش و پرداخت ان کے والد ماجد کی آغوش اور ان کی معیت اور ان کی نگرانی میں ہوئی۔ علامہ سید سلیمان ندوی ؒ نے صحیح بخاری کی پہلی روایت کی طرح اس دوسری روایت کو بھی بڑی حد تک نبھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے درایتی سقم کے پیش نظر یہ کہنے کے لیے مجبور ہو گئے کہ یہ روایت مرفوع نہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کی اسرائیلیات سے ہے[3]۔

کہاں سیرت اسماعیل ؑ کی یہ روایتی بے جانی اور کہاں قرآن کا یہ بیان کہ دوسری بیوی کے بھگانے سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے حکم اور اس کی ہدایت کے مطابق ایک خاص مقصد اور ایک خاص مشن یعنی بیت اللہ کی آبادکاری کے لیے انھیں سرزمین مکہ میں جا بسنے کا حکم ہوا:

۱- ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتك المحرم - ربنا لیقیموا

بارِالٰہا! میں اپنی اولاد کو ایک بے آب وگیاہ وادی میں تیرے قابلِ احترام گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ بارِالٰہا! تاکہ وہ

---

[1] بئرِ سبع اور کنعان کی تعیین وتفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، 'آنحضرت کا سلسلۂ نسب اور اہلِ کتاب'۔ مسکن ابراہیم ؑ واسماعیل ؑ کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، 'ذبیح کون ہے؟' ص ۴۴-۴۸، نیز ص ۱۲۲-۱۲۴۔

[2] ارض القرآن میں علامہ سید سلیمان ندوی بھی "فلما بلغ معہ السعی" سے اسی استدلال کے قائل ہیں۔ ارض ۲/۴۳

[3] ارض القرآن: ۲/۴۴-۴۶۔ اس موقع پر علامہ کا اس روایت کو غیر مرفوع کہنا ان کی اپنی رائے ہے ورنہ بخاری میں اس سے پہلے کی حدیث کے ذیل میں ایک عدم رفع کا جو تذکرہ ہے اس کی توجیہ اس سے مختلف ہے۔ یہ اس ضمن کے ایک واقعے کے جزئیے کا اختلاف ہے۔ سیدنا اسماعیل ؑ کی شیر خوارگی کا واقعہ اس سے متاثر نہ ہو کر اپنی جگہ جوں کا توں برقرار رہتا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے فتح الباری: ۶/۲۵۰-۲۵۱)۔

الصلوٰۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون[1]

نماز قائم کریں۔ تو تو ایسا کردے کہ لوگوں کے دل ان کی طرف جھک جائیں اور تو ان کے لیے پھلوں سے روزی کا سامان کر جس سے کہ وہ تیرے شکر گزار ہوں۔

۲- واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل ط ربنا تقبل منا انك انت السمیع العلیم[2] ۝

وہ بھی کیا وقت تھا جب کہ ابراہیم ؑ کعبہ کی بنیادوں کو اُٹھا رہے تھے اور اسماعیل ؑ اس کام میں ان کے مددگار تھے، اور ان کی زبانوں پر یہ دعا جاری تھی کہ بارِالٰہا! تو ہماری اس محنت کو قبول فرمالے بیشک تو ہی سب سے بڑھ کر سُننے اور جاننے والا ہے۔

کتاب اللہ کی روشنی میں احادیث وآثار کی تحقیق اور کتاب الٰہی سے ان کے استناد واستنباط کے سلسلے میں ترجمان القرآن فراہی نے اپنے پیچھے جو ناتمام ذخیرہ چھوڑا ہے، اس کے بعض نکات اور بعض دفعات سے اختلاف کے باوجود بہ حیثیت مجموعی اس میدان میں بھی ان افکار وآرا کی گہرائی اور گیرائی میں کوئی کلام نہیں۔ جسے پھیلایا جائے اور اس کی روشنی میں نئے کاموں کی منصوبہ بندی کی جائے تو علوم الحدیث کی دنیا میں ایک انقلاب آسکتا ہے، اور اس کی بدولت ایک کارآمد اور حیات بخش اسلامی لٹریچر سامنے آسکتا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ النبی الکریم۔

---

[1] سورۂ ابراہیم: ۳۷

[2] سورۂ بقرہ: ۱۲۷